شاہدہ حبیب

عہدِ اسلامی اور پاک و ہند کے طرزِ تعلیم کا جائزہ

ابتدائی دور :-

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں ارشاد ہوا : اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ (العلق : ۱)

اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو پیدا کیا۔

سب سے پہلے حضورؐ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے زیادہ ضروری اگر کوئی اور کام ہوتا تو پہلے اس کی تلقین کی جاتی۔ قرآن کریم میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی :
وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝ (طٰہٰ : ۱۱۴)

(اے پیغمبر) کہیے کہ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما۔

نیز فرمایا گیا : قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط (الزمر : ۹)

(اے پیغمبر) ان سے کہیے کہ کیا عالم اور جاہل دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

دوسری جگہ ارشاد ہوا : يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط (المجادلہ)

اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنین اور اہل علم کے درجے بلند کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیا کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود تعلیم و تدریس کی خدمت سونپی گئی : وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ق (الجمعہ : ۲)

(اے پیغمبر) آپ ان کو علم و حکمت سکھاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ سردار انبیا ہوتے بھی معلّمی کے فرائض انجام دینا آپ اپنا فریضۂ منصبی سمجھتے تھے۔

ظہور اسلام سے قبل عرب شرفا میں لکھنے پڑھنے کو عیب سمجھا جاتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ خال خال نظر آتے تھے۔ مؤرخ بلاذری کے بیان کے مطابق مکہ کے شہر میں کُل ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا

جانتے تھے۔ اسلام آیا تو مسلمانوں کا ایک ایک گھر تفسیر، حدیث و فقہ کا دارالعلم بن گیا۔ دینی اعتبار سے ضروری قرار دیا گیا کہ ہر قبیلے میں کچھ لوگ ایسے ضرور موجود ہوں جو تعلیم و تبلیغ کا فرض انجام دے سکیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے :

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب تحصیل علم کے لیے نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا جائے کہ ہر ایک جماعت میں سے چند آدمی نکل آئیں تاکہ دین کا علم سیکھیں اور اس میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو لوگوں کو ڈرائیں تاکہ لوگ بری باتوں سے احتراز کریں (توبہ : ۱۲۲)

چوں کہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شرعی احکام سے واقف ہو بلکہ شب و روز آں حضرت کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے جس کی رفتار گفتار، چال ڈھال، نشست و برخاست ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے مطابق ہو تاکہ وہ تمام دنیا کے لیے نمونۂ عمل بن سکے۔ اس لیے عرب کے ہر قبیلے سے ایک ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ ور ہوتی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کا فرمان ہے : عرب کے ہر قبیلے کا ایک گروہ آں حضور کے پاس جاتا اور آپ سے دینی مسائل دریافت کرتا، دینی فہم اور ادراک حاصل کرتا، دینی مبلغ جو مختلف علاقوں میں بھیجے جاتے ان کو ہدایت کی جاتی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینے آجائیں اور یہاں قیام کریں، اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اسّی افراد کو لے کر آئے اور مدینے میں آباد ہوئے۔

رسول اکرم کے زمانے میں تعلیم و تدریس کے مختلف طریقے تھے، ایک یہ کہ باہر سے آنے والے کچھ عرصہ خدمت اقدس میں رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے اور اپنے قبائل میں واپس جا کر ان کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن حویرث نے مدینے آکر بیس دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی، جب واپس جانے لگے تو آپؐ نے فرمایا :

اپنے خاندان میں واپس جاؤ اور ان میں رہ کر انھیں دینی مسائل سکھاؤ اور جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو[۱]

---

[۱] سنن ابن ماجہ : باب فضل العلماء والحث علی العلم۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا طریقۂ تدریس یہ تھا کہ لوگ مستقل طور سے مدینے میں آکر سکونت پذیر ہوتے اور علم دین حاصل کرتے۔ مسجد نبوی کا صحن جسے صُفّہ کہا جاتا تھا، وہ اُن کی درس گاہ تھی۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو عام دنیوی تعلقات سے آزاد ہوکر شب و روز خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے، اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر اور حلقۂ درس۔ آپ حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔[۲]

اصحابِ صفہ صرف راہِ علم کے جادہ پیما نہ تھے بلکہ میدانِ جہاد کے غازی بھی تھے۔ غزوات میں حصہ لیتے اور دادِ شجاعت دیتے۔ اصحابِ صفہ اگرچہ مال و زر سے بہرہ ور نہ تھے تاہم صبر و قناعت اور سکون و اطمینان سے ضرور مالا مال تھے۔ ان کے فقر و افلاس کا یہ عالم تھا کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہ ہوتا جس کو وہ گردن سے باندھ کر چھوڑ دیتے، وہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا۔ ان کی جفاکشی کی حد یہ تھی کہ جنگل میں جاکر لکڑیاں لاتے اور ان کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے اور آدھا اپنے ہم مکتب بھائیوں کے ساتھ مل کر کھاتے۔ اس درس گاہ کے فاضل معلمین میں مشہور صاحبِ علم صحابی حضرت عبادہؓ بن صامت بھی تھے جن کو حضرت عمرؓ خلیفۂ دوم نے اپنے زمانۂ خلافت میں تعلیم فقہ اور تدریسِ قرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا۔[۳]

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درس گاہ صفہ کے علاوہ بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحابِ صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ اصحابِ صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔[۴]

جنگ بدر میں قریش کے بعض آدمی گرفتار ہوئے جو لکھے پڑھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو تو تم آزاد ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں لکھنے پڑھنے کی کیا اہمیت تھی۔ نبی کریم برملا اپنے آپ کو معلم قرار دیا کرتے تھے:

بُعِثْتُ مُعَلِّماً : مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔[۵]

صحیح بخاری میں ہے کہ قرآن کریم پڑھانے کی فضیلت آں حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی:

---

[۲] مشکوٰۃ: کتاب العلم۔ سنن ابنِ ماجہ: باب فضل العلماءٔ والحث علی طلب العلم۔

[۳] ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ [۴] مسند امام احمد بن حنبل: ۳ : ۱۳۷

[۵] سنن ابن ماجہ: باب فضل العلماءٔ والحث علیٰ طلب العلم۔

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ :

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں علم و علما کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہمیشہ علم کی اشاعت، مکاتب کی تعمیر اور تصنیف و تالیف کی حوصلہ افزائی کرتے رہے مکاتب کی تعمیر کا سلسلہ اسلام میں عہدِ نبوی سے شروع ہوا مسجد نبوی کا سائبان جسے صفہ کہتے تھے اوّلین اسلامی یونیورسٹی تھی۔ معلّمِ اعظم نبی کریمؐ اس کے اوّلین استاد تھے اور مدینے کے نادار صحابہ جنھیں دنیا اصحابِ صفہ کے نام سے جانتی ہے اس یونیورسٹی کے اولین طلبا تھے۔

خلافتِ راشدہ میں تعلیم و تدریس

علم نوازی کا سلسلہ خلافتِ راشدہ میں بھی جاری رہا۔ عہدِ صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی تدوین ہے۔ جماعتِ صحابہ میں صدیق اکبرؓ سب سے زیادہ اسرارِ شریعت کے محرم اور روحِ اسلامی کے رازداں تھے۔ قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ میں آپ کا پایہ نہایت بلند تھا۔ قرآن پاک کے فہم و تدبر میں بے مثال ذہن پایا تھا۔ وہ علم الانساب کے بڑے ماہر تھے اور ان کا شمار علمائے انساب میں ہوتا تھا۔ صحابہ اور عوام کو شرعی علوم سکھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ اکابر صحابہ بھی ان سے مسائل سے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے[۶]

خلفائے راشدین تک تعلیم کا مقصد اور مطلب مذہبی علوم کا حصول تھا، لہٰذا اس کی تدریس ہر پہلو سے کی جاتی تھی۔ طبری میں مرقوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ اپنے زمانے میں تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کی تعلیم کے لیے مکتب قائم کیے اور ان کے لیے تنخواہ دار معلمِ قرآن مقرر کیے۔ ان مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ حفاظِ قرآن صحابہ کو مختلف مقامات پر قرآن کا درس دینے کے لیے بھیجا[۷] سورہ بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور کو جن میں احکام بیان ہوئے ہیں یاد کرنا ضروری قرار دیا[۸] قرآن پاک صحیح پڑھنے اور اعراب کی تصحیح کے لیے ادب و عربیت کی تعلیم کی تاکید کی، جو لوگ لغت کے عالم نہ تھے انھیں قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی[۹] قرآن کے طلبا کے وظائف مقرر کیے۔ ان کے زمانے میں ہزاروں حفاظِ قرآن

---

[۶] تاریخ الخلفاء: ۸۰   [۷] کنز العمال: ۱ : ۲۸۱   [۸] ایضاً ص ۲۲۴

[۹] ایضاً ص ۲۲۸

پیدا ہو گئے۔[۱]

کلام اللہ کے بعد حدیث کا درجہ ہے چنانچہ اس کی تلاش، حفاظت اور اشاعت کے لیے انتظام کیا۔ حفاظ حدیث صحابہ کو حدیث کی تعلیم دینے کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا۔[۱۱] حضرت عمر خود بھی لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے، خطبوں اور تقریروں میں بیان فرماتے، صحابہ کے مجمع میں مسائل پیش کر کے زیر بحث لاتے، سرکاری حکام انتظامی ذمہ داریوں کے علاوہ مذہبی معلم بھی ہوتے۔ آپ فرماتے کہ میں نے حکام کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو مسائل اور احکام بتائیں۔[۲] عمال اور حکام کے علاوہ حضرت عمر نے تمام مفتوحہ ممالک میں مستقل فقہا اور معلم مقرر کیے۔ ابن الجوزی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فقہا کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں۔

مذہبی خدمات کے سلسلے میں حضرت عثمان کا سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کو قرآن کی ایک قرات اور ایک مصحف پر متحد کرنا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی اصلاح مدینے میں حضرت عثمان خود انجام دیتے، ان کو مسائل بتاتے اور ان کی تربیت کرتے۔[۳] حضرت عثمان احادیث نبوی کے بھی ممتاز حافظ تھے، اس لیے صحابہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ احادیث سکھاتے۔[۴] فقہ میں بھی حضرت عثمان بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر اور عمر کے عہد میں وراثت کے مسائل آپ حل کرتے اور اس فن کی تعلیم دیتے۔[۵]

کاتب نبوت سے جو فیض حضرت علی کو پہنچا وہ دوسرے کم صحابہ کے حصے میں آیا ہے۔ آپ قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہی علوم کے ماہر تھے، زبان نبوت سے انھیں "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" کی سند ملی۔ ان کے تلامذہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ صحابہ میں جن بزرگوں نے احادیث قلم بند کیں ان میں حضرت علی بھی تھے۔[۶]

فقہ میں حضرت علی کا پایہ بہت بلند تھا اور جماعت صحابہ میں ان کو امامت واجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ اکابر صحابہ کا ان سے سوالات کرنا اور مشکل مسائل میں ان کے فتاویٰ اور اقوال کی طرف رجوع کرنا مشہور ہے۔[۷] فرائض یعنی تقسیم میراث کے فن میں حضرت علی مدینے

---

[۱] کنز العمال: ۱: ص ۲۱۷	[۱۱] ازالۃ الخفا: ۲ ص ۶۱
[۲] کتاب الخراج ص ۶۷	[۳] تاریخ الخلفا ص ۱۶۵
[۴] تذکرۃ الحفاظ: ۱ ص ۸	[۵] کنز العمال: ۶ ص ۲
[۶] بخاری شریف، کتاب العلم	[۷] تہذیب الاسماء: ۱ ص ۳۴۶

کے ممتاز علما میں تھے[18] حضرت علی تحریر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے خطوط اور تحریریں ادب و انشا کا دلکش نمونہ ہیں۔ حدیبیہ کا صلح نامہ انہی نے لکھا تھا۔ لہذا لوگوں نے فن تحریر میں ان سے استفادہ کیا۔ فن نحو کی بنیاد حضرت علی نے رکھی۔ عجمی کلام مجید پڑھتے تھے تو اس کی تصحیح کے لیے نحو کی ضرورت محسوس ہوئی اس لیے قواعد کے اصول مرتب کیے گئے[19]

چاروں خلفائے راشدین چونکہ خود عالم تھے اور علم کے قدردان بھی تاہم تعلیم و تدریس کا سلسلہ مساجد میں ہی جاری رہا۔ محدثین اور فقہا کے حلقہ ہائے درس مساجد میں منعقد ہوتے تھے۔ تشنگان علم نزدیک اور دور سے آتے اور ان علمی سرچشموں سے سیراب ہوتے۔

خلفا کی وابستگی مساجد سے قائم رہی اور وہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ مساجد میں امامت کے فرائض خود حضورؐ سے لے کر تمام خلفا نے انجام دیے۔ جمعہ کو منبر پر لوگوں کو علمی فوائد سے آگاہ کرتے۔

عہد بنو امیہ میں تعلیم و تدریس

تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مساجد کو امتیازی حیثیت حاصل رہی اور وہ خانۂ خدا ہونے کے علاوہ درس گاہ اور یونیورسٹی بھی تصور کی جاتی تھی۔ اموی خاندان کے بانی حضرت معاویہ تاریخ کے بڑے دلدادہ تھے، حضرت معاویہ نے اس زمانے کے ایک ممتاز اخباری عبید بن شریح سے تاریخ قدیم کی داستانیں، سلاطین عجم کے حالات، زبانوں کی ابتدا اور اس کے پھیلنے کی تاریخ لکھوائی۔ یہ مسلمانوں میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تھی[20]

عبدالملک، ولید، عمر بن عبدالعزیز اور ہشام سب علم دوست خلفا تھے۔ علما اور تابعین نے دینی علوم کو پھیلایا، دینی علوم کا تدوین کا آغاز ہوا، بعض نئے علوم پیدا ہوئے اور غیر قوموں کے بعض نئے علوم سے مسلمان روشناس ہوئے۔ اموی خلفا سخن سنج اور شاعری کے قدر دان تھے، اس لیے شاعری کو عروج ہوا۔ اس دور کی علمی جماعت بندی کی وجہ سے خطابت کو ترقی ہوئی حجاج بن یوسف اور طارق بن زیاد فاتح اندلس اس دور کے ممتاز خطیب تھے۔

اس دور میں عربی انشا میں بڑی ترقی ہوئی اور نامور کاتب پیدا ہوئے ان میں عبدالملک کا کاتب سالم اور عبدالحمید زیادہ مشہور ہیں[21] اس دور میں تفسیر قرآن کے فن میں بھی ارتقا ہوا اس میں سعید بن جبیر اور حسن بصری زیادہ نامور ہیں

۱۸ؔ مسند احمد بن حنبل : ۱ ص ۱۴
۱۹ؔ فہرست ابن ندیم ص ۶۰
۲۰ؔ ایضاً
۲۱ؔ ایضاً ص ۸۰

قرآن مجید کے مشہور قرائے سبعہ یعنی سات قاری بنی امیہ کے دور سے تعلق رکھتے تھے۔ تلاش، احتیاط اور جستجو سے محدثین نے اس دور میں احادیث نبوی کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کیا۔ حدیث کی تدوین اور اشاعت میں سب سے بڑا کارنامہ عمر بن عبدالعزیز کا ہے۔ انھوں نے علما سے احادیث کے مجموعے مرتب کرائے اور ان کی نقلیں تمام ممالک مفتوحہ میں بھیجیں[۲۲]

فقہ میں دو کتابیں سنن اور کتاب المسائل مکحول نے لکھیں۔ دوسری کتاب امام زہری کے فتاویٰ ہیں جو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیے گئے۔

ہشام کو علوم و فنون سے دلچسپی تھی، اس نے فارسی کی ایک اہم کتاب کا جو ایرانیوں کے مختلف علوم اور ان کے فرماں رواؤں کے سیاسی واقعات پر مشتمل تھی، ترجمہ کرایا۔ یہ کتاب مسعودی کی نظر سے گذری تھی[۲۳]

عبدالملک کو عربی زبان کی ترقی و اشاعت سے خاص دلچسپی تھی، اس نے عربی کو دفتری زبان بنایا۔ وہ ادیبوں سے ادبی مباحثے کراتا تھا۔ زبان اور لغت کے جو شائقین عربی میں کمال حاصل کرنا چاہتے تھے وہ خالص عرب کے دیہاتوں میں جاتے تھے۔ مغازی، سیرت، گرامر، سائنس، جغرافیہ اور دوسرے متعدد نئے علوم عالم وجود میں آئے[۲۴]

اموی سلطنت کے گوشے گوشے سے طلبا عربی تلفظ، نظم و غزل اور دیگر علوم سیکھنے کے لیے آتے۔ جو صحیح عربی بولنے پر قادر ہوتے، پیراکی اور تیر کمان کا استعمال جانتے، وہ عالم گردانے جاتے اور لوگ انھیں کامل کے لقب سے یاد کرتے۔ مساجد میں قرآن حکیم کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جانے لگا۔ مکاتب میں معلمین بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتے۔ حضرت عائشہ کے ایک غلام علقمہ ایک مکتب میں عربی زبان کی تعلیم دیتے تھے[۲۵]

بنو امیہ کے دور میں مدارس کے علاوہ علما کے بڑے بڑے حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ دنیائے اسلام کے جن جن حصوں میں صحابہ اور تابعین موجود تھے، وہاں ان کے حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، اس میں اتنا اجتماع ہوتا کہ آمد و رفت

۲۲؎ تہذیب الاسماء : نووی : ۱ ص ۹۱

۲۳؎ ابن سعد : ۵ ص ۱۳۳

۲۴؎ ابن خلکان : معجم الادباء : ۴ ص ۱۷۴

۲۵؎ معارف : ابن قتیبہ ص ۱۵۰

مشکل ہو جاتی۔ قرآن، حدیث، حلال، حرام، فقہ، عربی زبان، شاعری، ادب اور انشا وغیرہ تمام علوم کی تعلیم دی جاتی۔ پھر مختلف سوالات کے جواب دیے جاتے[۲۶]

مدینے میں درس و تدریس کے کئی حلقے تھے، ان میں ربیعۃ الرائی کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ اس میں ہر وقت طلبا کا ہجوم رہتا۔ امام مالک، امام اوزاعی، یحیٰ بن سعید انصاری اسی حلقۂ درس کے فیض یافتہ تھے[۲۷]

حضرت عمر کے غلام اسلم کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا۔ ایک وقت میں چالیس چالیس فقہا اس میں شریک ہوتے۔ اس میں امام زین العابدین جیسے بزرگ بھی تھے[۲۸]

عبداللہ بن ذکوان کا حلقۂ درس اپنی شان و شوکت میں بادشاہوں کے درباروں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ عبد ربن ربہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوالزناد کو اس شان سے مسجد نبوی میں دیکھا کہ ان کے ساتھ اتنا ہجوم تھا کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا، اس میں فرائض، حساب، شعر، حدیث اور مختلف علوم کے طلبا موجود تھے۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ ابوالزناد کے پیچھے پیچھے بیک وقت مختلف علوم کے تین تین سو طالب علم چلتے[۲۹]

حجاز کے بعد علم کا دوسرا مرکز کوفہ تھا، یہاں درس کے بڑے بڑے حلقے تھے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ امام شعبی، مسعر بن کرام، حمص میں خالد بن کرام کے وسیع حلقے تھے[۳۰]

اموی دور میں جتنے مدارس اور مکاتب قائم تھے، ان کے انتظام کے لیے املاک وقف ہوتی تھیں۔ اموی خلفا تعلیم کی باقاعدہ سرپرستی کرتے تھے، انھوں نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف انتظام کر رکھے تھے۔

عباسی دور میں تعلیم و تدریس

بنو امیہ کے بعد عباسی دور آیا۔ اس دور میں تعلیمی ترقی اپنے عروج پر تھی۔ عباسی خلفا تعلیم اور

---

[۲۶] مستدرک حاکم: ۳ ص ۵۸۳

[۲۷] تاریخ خطیب: ۸ ترجمہ ربیعۃ الرائی

[۲۸] تہذیب التہذیب: ۲ ص ۲۵۶

[۲۹] تہذیب الاسمأ: ۱ ص ۲۲۳

[۳۰] تہذیب التہذیب: ۶ ص ۲۶۰

معلموں کے انتہائی قدردان تھے۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم اس دور میں دو گروپوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ (۱) ابتدائی مکاتب (۲) اعلیٰ تعلیمی ادارے (کالج) ابتدائی تعلیم کے مکاتب مسجدوں کے ساتھ ملحق تھے۔ قرآن حکیم ان مکاتب کی درسی کتاب تھی۔ پروفیسر ہتی کے مطابق نجی عمارتوں میں بھی مکاتب قائم تھے مگر مساجد سے ملحق مکاتب کی تعداد زیادہ تھی[۱۳۱]

یعقوبی کا بیان ہے کہ صرف بغداد میں تیس ہزار مساجد تھیں۔ ان مساجد کے علاوہ مکاتب بھی قائم تھے جو ابتدائی تعلیم کے اداروں کے طور پر کام کرتے تھے۔ گویا صرف دارالحکومت میں ابتدائی مکاتب کی تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔ ابتدائی مکاتب میں زبان اور قواعد کی تعلیم دی جاتی تھی، ساتھ ہی احادیث کا علم سکھایا جاتا تھا، ریاضی کے ابتدائی اصول بتائے جاتے تھے، بعض چیزوں کے حفظ کرنے پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی[۱۳۲]

سینئر طلبا قرآن پاک کی تفسیر، علم حدیث، فقہ اور ادب کا مطالعہ کرتے اور محققین اعلیٰ تعلیم میں علم ہیئت، جومیٹری، فلسفہ، موسیقی اور طب کا مطالعہ کرتے جو طالب علم دینی تعلیم میں مہارت حاصل کر کے سند حاصل کرتے اور فقہ میں ماہر ہوتے وہ تعلیم کو بطور پیشہ اپنا لیتے۔ خواتین کے لیے قرآن پاک اور مذہبی علوم کی تعلیم لازمی تھی۔ معاشرے کے اصحاب ثروت گھروں میں بچوں کی تعلیم کے لیے اتالیق مقرر کرتے۔

خلیفہ مامون نے ایک بہت بڑا مدرسہ دارالحکمت کے نام سے قائم کیا[۱۳۳] پروفیسر ہتی کے مطابق اس مدرسے میں نہ صرف یہ کہ مختلف زبانوں سے عربی میں کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا بلکہ یہ ادارہ ایک اکیڈیمی کی حیثیت سے بھی کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑی لائبریری اور اجرام فلکی کے مطالعے کے لیے بہت بڑی رصدگاہ بھی تھی۔ اس کے پرنسپل کو خلیفہ نے یونان کے دورے پر بھیجا تاکہ یونان کی عمدہ کتابوں کا انتخاب کر کے ان کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے[۱۳۴]

---

۱۳۱ ہتی: ہسٹری آف دی عرب

۱۳۲ تاریخ خطیب: ۱ ص ۵۱

۱۳۳ کتاب البلدان ص ۲۴۳ تاریخ الخلفاء ص ۳۱۱

۱۳۴ ہتی: ہسٹری آف دی عرب

مؤرخوں کے مطابق بیت الحکمت کو قرون وسطیٰ کی پہلی یونیورسٹی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بیت الحکمت کا لائبریرین انجارج اپنے وقت کا مشہور ریاضی داں اور ماہر ہیئت الخوارزمی تھا۔ بہت سے دانشور اور اسکالر مثلاً ابونواس، الطبری، الیعقوبی، مسعودی اس وقت بغداد کے دانش کدوں میں علم و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے[۳۵]۔

نظامیہ یونیورسٹی میں امام غزالی چار برس درس دیتے رہے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ جو معلم قرآن کا درس دیتے انھیں تنخواہ ملتی تھی۔ بتدریج تنخواہ میں اضافہ ہوا اور اساتذہ کو پندرہ دینار روزانہ تک معاوضہ ملنے لگا۔ مساجد کی ملحقہ جائداد اور امیر لوگوں کے عطیات سے مدرسوں کے اخراجات پورے کئے جاتے اور بعض اساتذہ اور طلبا کو بیت المال سے تنخواہ اور وظیفہ ملتا۔

تعلیم کا کوئی باقاعدہ نصاب مقرر نہیں تھا۔ ہر استاد کا اپنا طریقۂ تعلیم تھا۔ وہ کسی موضوع پر لیکچر دیتا اور پھر اپنی لکھی ہوئی کتابیں طلبا کو مطالعہ کرنے کو کہتا۔ بعض اوقات کسی خاص مضمون پر دوسرے محققین کی لکھی ہوئی کتابیں بھی پڑھائی جاتیں۔

مکاتب قائم کرنے والوں کو اساتذہ کے تقرر اور برطرفی کا اختیار تھا، مگر تعلیم کا طریقہ متعین کرنے میں استاد بالکل آزاد تھے۔ حکومت دخل اندازی صرف اس وقت کرتی جب بے دینی پھیلنے کا خطرہ ہوتا۔ ان دنوں طلبا کو کسی خاص مقررہ وقت پر چھٹی نہ دی جاتی۔ تعطیلات کا انحصار کسی خاص موضوع پر لیکچروں کا کورس مکمل ہونے پر تھا۔ لیکچر نہایت آہستہ آہستہ دیا جاتا تاکہ استاد جو کچھ بولے طلبا اسے پوری طرح نوٹ کر لیں۔

پروفیسر محض لیکچر دے کر مطمئن نہیں ہو جاتے تھے بلکہ ہر بات کو ذہن نشین کراتے۔ بعض اوقات اساتذہ درس گاہ سے باہر بھی طلبا سے کسی خاص موضوع پر بحث مباحثہ کراتے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تعلیم محض لیکچر سننے تک محدود نہ تھی، بلکہ متعلقہ موضوع کا اچھی طرح اور سمجھ سوچ کر تنقیدی مطالعہ کیا جاتا۔ جب طالب علم استاد کو مطمئن کر دیتا کہ اس نے متعلقہ مضمون میں مہارت حاصل کر لی ہے تو وہ استاد سے سندِ فراغت (اجازہ) کے لیے درخواست کرتا، اس طرح وہ سندِ فراغت حاصل کر سکتا تھا[۳۶]۔

۳۵ؔ تاریخ خطیب : ۱ ص ۵۱

۳۶ؔ تعلیم المتعلم تاریخ التعلم : ۱۴ - ۱۹

اسپین میں شعبۂ تعلیم و تدریس

اسپین میں بھی دیگر مسلم ممالک کی طرح مساجد کے ساتھ مدارس قائم کرنے کا رواج تھا۔ لیکن بہت سے مدارس اور جامعات مساجد سے علیحدہ بھی تھیں۔ ان مدارس کے اخراجات کے لیے حکومت نے بڑے بڑے اوقاف مقرر کر دیے تھے اور اکثر خصوصی امداد بھی دی جاتی تھی۔ مدارس میں مفت تعلیم دی جاتی اور ہر مسلمان کے لیے تعلیم حاصل کرنا لازمی تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ، صرف، نحو، شعر و ادب کی تعلیم عام طور پر مدارس میں ہوتی، لیکن جامعات میں تمام علوم عقلیہ (سائنس) اور علوم نقلیہ کی تعلیم دی جاتی۔

ابن خلدون کہتے ہیں کہ اسلام کی پہلی تین صدیوں میں مسجد ہی درس گاہ ہوتی تھی، جب نئی درس گاہ کی ضرورت ہوتی تو ایک اور مسجد تعمیر کر لی جاتی، گویا عبادت اور تعلیم لازم ملزوم تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں الگ مدرسوں کا اہتمام ہونے لگا۔

ابن خلکان کے مطابق تمام ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں مدارس قائم تھے۔ یہ مدارس کسی نہ کسی جامعہ سے ملحق ہوتے، ملک کی اہم جامعات میں قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، مالقہ، طلیطلہ کے نام آتے ہیں۔ بعض شہروں میں مدارس کی تعداد سیکڑوں تک تھی، صرف قرطبہ میں آٹھ سو مدارس تھے جن میں جید اساتذہ بلاتفریق مذہب و ملت تعلیم دیتے تھے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کر کے جب طالب علم اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ میں داخل ہوتا تو اس کے داخلے کا امتحان لیا جاتا، جو پاس ہوتا اسے داخلہ دیا جاتا ورنہ تیاری کرنے کے لیے معاملہ اگلے سال پر چھوڑ دیا جاتا۔

اعلیٰ تعلیم کے مضامین

قرآن، حدیث، فقہ کے علاوہ علوم قدیمہ، ہندسہ، ہیئت، طب، جراحت، موسیقی، منطق، فلسفہ، ادب، تاریخ، جغرافیہ، پیشہ وارانہ فنون مثلاً خیاطی، خطاطی، چمڑے کا کام، فن تعمیر، کوزہ گری، زراعت اور تمام علوم سائنسی کا شمار اعلیٰ مضامین میں ہوتا تھا۔[۳۷]

اسکاٹ کا بیان ہے کہ طلبا کے ٹھہرنے کے لیے جامعات کے قریب اقامت گاہیں (ہوسٹل) بھی بنائے جاتے جن کے تمام اخراجات کی ذمہ داری حکومت پر تھی۔ حتیٰ کہ متعلقہ کتابیں بھی طلبا کو

۳۷؎ اسکاٹ: ۳ ص ۵۱۳ (تاریخ اسپین)

مفت حکومت کی طرف سے دی جاتیں۔ جامعات کی مدرسی اور منتظمی کے لیے کسی شخص کا مسلمان ہونا ضروری نہ تھا چنانچہ اکثر یہودی اور عیسائی بھی قرطبہ کی جامعہ میں استاد تھے[۳۸]

میڈیسن اور سرجری پر اسپین کی جامعات کو بڑا ناز تھا۔ داخلے کے وقت قابل ترین طبیب ان طلبا کا امتحان لیتے جو میڈیسن کی سند حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح اختتام تعلیم پر بھی فاضل اساتذہ امتحان لیتے۔ کامیاب اور ناکام طلبا کی فہرست شائع کر دی جاتی۔ مدارس کا نصاب، جامعات کے داخلے کا امتحان، سندیں، انعامات، وظائف اور بحث مباحثہ کا وہی طریقہ رائج تھا جو آج کل بھی ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے[۳۹]

سائنس اور فنون کی تجرباتی تعلیم کے لیے جامعات میں مکمل تجربہ گاہیں قائم کی جاتی تھیں، جن میں بہترین سائنسی اور فنی آلات ہوتے تھے۔ قرطبہ اور غرناطہ میں سرجری کے مکمل شعبے تھے جن میں جدید آلات جراحت موجود تھے۔ عملی تجربے کے لیے اساتذہ طلبا کو اپنی نگرانی میں دور دراز مقامات پر لے جاتے[۴۰]

عورتیں صرف علوم نقلیہ حاصل کرتیں۔ علامہ مقری نے شعر و ادب، فلسفہ اور منطق جاننے والی عورتوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ غرناطہ کی جامعہ بنو نصر کے زمانے میں قائم ہوئی جس کی مشہور شخصیت لسان الدین ابن الخطیب بھی تھے[۴۱]

مصر کی جامعہ ازہر

فاطمی خاندان کے بیشتر خلفا خود بھی دانشور تھے اور علم کے سرپرست بھی۔ العزیز اچھا شاعر اور علم سے محبت رکھنے والا تھا۔ یہی وہ خلیفہ تھا جس نے جامعہ ازہر قائم کی جو آج تک قائم ہے اور ہزار سالہ پرانی درس گاہ کی حیثیت سے مشہور ہے[۴۲]

فاطمی خلفا نے ملک بھر میں مختلف مکاتب، کالج، لائبریریاں اور سائنسی تعلیمی ادارے قائم کیے۔

۳۸؎ اسکاٹ : ۳ ص ۵۱۳ (تاریخ اسپین)

۳۹؎ مقریزی : ۱ ص ۵۹۴

۴۰؎ ہسٹری آف دی عربس : ص ۵۶۲

۴۱؎ علامہ مقری : ص ۵۳۶

۴۲؎ قفطی : ص ۲۳۰-۲۳۱

خلیفۂ الحاکم نے ۱۰۰۵ء میں دارالحکمۃ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اس میں ایک بڑی لائبریری بھی تھی۔ الحکم نے ایک رصدگاہ بھی بنائی جس سے وہ ستاروں کی چال اور موسم کا حال معلوم کرتا تھا۔[۴۳]

حکومتِ مغلیہ اور درس و تدریس

اب ہم برصغیر کی اہم اسلامی حکومت مغلیہ میں شعبۂ تعلیم اور درس و تدریس کا ذکر کرتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں ملّا نظام الدین فرنگی محلی نے تعلیم کے لیے ایک نصاب مرتب کیا تھا۔ یہ نصاب پچھلے طریقۂ تعلیم کو نظر میں رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اس نصاب میں پہلے یہ گیارہ مضامین درس کے لیے شامل کیے گئے: (۱) صرف (۲) نحو (۳) منطق (۴) حکمت (۵) ریاضی (۶) بلاغت (۷) فقہ (۸) اصول فقہ (۹) کلام (۱۰) تفسیر قرآن (۱۱) حدیث۔

کچھ عرصہ کے بعد مزید چار مضامین اس نصاب میں شامل کیے گئے جو یہ ہیں (۱) ادب (۲) فرائض (۳) مناظرہ (۴) اصول حدیث۔

طلبا کو اگلی جماعت میں ترقی متعلقہ اساتذہ کی رائے کے مطابق دی جاتی تھی۔ اس کا کوئی تحریری امتحان اس وقت نہیں ہوتا تھا بلکہ جو کام انھوں نے پورے اکیڈمک دور میں کیا ہوتا اس کی بنا پر ان کو ترقی دی جاتی۔ استاد اپنے طلبا کو بہت قریب سے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ سالانہ امتحان کا کوئی طریقہ رائج نہیں تھا۔[۴۴] سندات کی تقسیم کے وقت ایک جلسے کا اہتمام کیا جاتا جس میں قابل اور اہل طلبا کو سندات دی جاتیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کا مدرسہ حدیث اور تفسیر میں مشہور تھا۔

فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسے میں فقہ کا مضمون اہم اور خاص تھا۔ سیال کوٹ کی درس گاہ میں صرف و نحو پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس دور کے طلبا ایک درس گاہ سے دوسری درس گاہ میں حصولِ علم اور قابل اساتذہ کی تلاش میں سرگرم رہتے تھے، استاد اور شاگرد کے درمیان افہام و تفہیم کے رشتے قائم ہوتے تھے اور یہی وہ اہم نکتہ ہے جو اسلامی دور میں حصول علم کی خاطر استاد اور شاگرد کے درمیان قائم رہا۔ شاگرد استاد کے قریب ترین رہنے کی کوشش کرتے تاکہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات سے استفادہ کریں۔

یہی حال پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا تھا بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے شاگرد اپنے استاد سے عملی تعلیم یا فن کی تکمیل کے لیے اور بھی قریب رہتا تھا، پیشہ ور شاگرد اپنے

---

۴۳ ابن خلکان: ۳ ص ۶ ۴۴ ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں: ۹۷

استاد کے فنون کے رازوں کو سمجھنے کے لیے اس کی قربت میں رہتا تھا۔[۴۵]

عالم اسلام کی قدیم تعلیمی کیفیت اور درس گاہوں کا حال اور اس دور کے اساتذہ اور طلبا کے شوقِ علم و ہنر کو معلوم کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز اور دوسری یورپین اقوام نے ہمارا ورثہ لے کر اپنی تاریخ تہذیب میں شامل کر لیا اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ قوموں میں شمار کرنے لگیں۔ مسلمانوں نے علمی، ادبی اور سائنسی و فنی ترقی اس وقت کی تھی جب اقوام مغرب جہالت کے اندھیرے میں گم تھیں۔ مغلیہ دور کے نقلی و عقلی تعلیم کے اس نصاب اور پیشہ ورانہ عملی تعلیم کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طریق کار عین اسلام کے مطابق اور اخلاقی و معاشرتی اور معاشی ضروریات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اس دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کو بھی خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس میں دو طبقے تھے، ایک شاہی خاندان اور محلوں میں رہنے والی عورتیں اور دوسری عام عورتیں۔ تاریخ فرشتہ سے مغلیہ دور کی خواتین کے ہر شعبۂ زندگی میں ارتقا و اہلیت کا پتا چلتا ہے۔[۴۶]

اس زمانے میں خواتین موسیقی، سلائی کڑھائی، مخمل سازی، لکڑی کا کام، سونے چاندی کا کام، تیر کمان بنانے کا کام، جوتے سازی، فن سپہ گری، شاعری، مذہبی علوم اور کھانے پکانے کا فن سیکھتیں اور اس میں مہارت حاصل کرتیں۔ شاہی خاندان کی خواتین کے علاوہ متوسط طبقے کی عورتیں بھی حصول علم کا بہت شوق رکھتی تھیں۔

مندرجہ بالا اسلامی ممالک کے طریق درس و تدریس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہی طریقہ نہایت مناسب اور ضرورت کے مطابق تھا۔ اب آیئے برصغیر پاک و ہند کے انگریزی طرز تعلیم کے بارے میں غور کریں۔

انگریزی تعلیمی دور

مغلیہ دور کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں کا ہندوستان میں دور دورہ ہوا تو انھوں نے اسلامی تہذیب کے ہر شعبے میں تبدیلی لانے کو اپنا فرض منصبی سمجھا۔ اگر کسی قوم کو اس کے ماضی سے بے خبر کرنا مقصود ہو تو اس کی زبان کو جو ثقافت کا ایک اہم جزو ہوتی ہے بدل دیں جب

---

[۴۵] ISLAMIC CULTURE April 1950

[۴۶] تاریخ فرشتہ ص ۲۵۵

زبان زوال پذیر ہوگی تو ثقافت کی دیواریں خود بخود منہدم ہو جائیں گی۔ جس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں حکمرانی کے فرائض انجام دے رہی تھی تو برٹش پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ مقبوضہ ملک یعنی ہندوستان میں کون سی سرکاری زبان رائج کی جائے، کیوں کہ مغلیہ دور کے آخر میں فارسی کے ساتھ اردو بھی استعمال کی جانے لگی تھی، انگریزوں کو یہاں کے پرانے طرز تعلیم پر بھی بڑی تشویش تھی کہ اس کو کس طرح تبدیل کیا جائے تاکہ اس ملک میں بجائے مسلمانوں کے انگریزوں کا وجود اور حکومت مستحکم ہو سکے اور ایسا طرز تعلیم عمل میں لایا جائے جس سے مسلمان نما انگریز پیدا ہوں جو اپنی تعلیم، زبان اور ثقافت پر عمل کرنے سے خود ہی ندامت اور شرمندگی محسوس کریں۔ چنانچہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر برطانیہ سے لارڈ میکالے کو ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ہندوستان آیا تو اس نے برٹش انڈیا کی تعلیم کا نظام بالکل مختلف طریقے سے قائم کر دیا۔ ہندوستان کو کئی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا، اپنے نظم و نسق کی آسانی کے لیے یہ قدم برٹش گورنمنٹ نے اٹھایا اور ہر صوبے کی حکومت پر وہاں کے تعلیمی نظام کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری عائد ہو گئی۔

انگریزوں نے یہاں دو طرح کے تعلیمی ادارے قائم کیے، ایک وہ جن میں انگریزوں کے بچے اپنے مخصوص برطانوی طریقے پر انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک قائم کیے گئے۔ ان کی فیس اور اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ عام ہندوستانی لوگوں کی قوت برداشت سے باہر تھے۔ وہ اپنے بچوں کو وہ تعلیم دلانا بھی چاہتے تو نہ دلا سکتے تھے۔ ان میں صرف انگریزوں نوابوں اور رئیسوں کے بچے ہی پڑھ سکتے تھے۔ ان کا نصاب اور طریق تعلیم دیگر نجی یا سرکاری تعلیمی اداروں سے بالکل مختلف تھا۔ دوسری قسم کے تعلیمی ادارے میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت قائم کیے گئے تھے، ان سکولوں میں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی تھی، بلکہ علاقائی زبانوں میں دیگر مضامین پڑھائے جاتے تھے، مثلاً ہندی، اردو، پنجابی، بنگالی، تامل، تلنگو وغیرہ زبانوں میں۔ ان پرائمری اور مڈل سکولوں میں تعلیمی سال ختم ہونے کے بعد وقت مقررہ پر سالانہ امتحان لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ میٹرک یا ہائی سکول کا امتحان بھی لیا جاتا تھا۔ یہ امتحان اس وقت میٹرکولیشن یا سکول لیونگ سرٹیفکیٹ کہلاتا تھا، تعلیمی فرائض کی انجام دہی کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے پبلک انسٹرکشن کا منصوبہ بنایا گیا تھا جو پرائمری اور ثانوی تعلیم کو پوری طرح کنٹرول اور سپروائز کرتا تھا۔ ان اداروں میں فارسی یا عربی وغیرہ کی تعلیم بھی (بطور زبان کے) دی جاتی تھی۔ میٹرک کے امتحان کو یونیورسٹی کے امتحان سے علیحدہ کر کے بورڈ ہائی سکول اینڈ انٹرمیڈیٹ قائم

کیا گیا۔ میٹرک اور ایف۔ اے کا امتحان یہی بورڈ لیتا تھا۔ ایف۔ اے تک کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیے گئے۔ ان تمام اداروں میں انگریزی کا مضمون لازمی تھا، باقی مضامین بھی انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے اور امتحان میں جوابات بھی انگریزی میں لکھنے ہوتے تھے۔ مذہبی علوم کا ان اداروں کے نصاب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے آرٹ یا سائنس کے مضامین میں بی۔ اے یا بی۔ ایس سی کیا جاتا۔

حکومت برطانیہ نے آٹھ فیڈرل یونیورسٹیاں قائم کیں، یہ دو طرح سے اپنے فرائض انجام دیتی تھیں، ایک تو جس میں وہیں داخلہ لے کر تدریس ہوتی اور دوسرے قسم کی یونیورسٹی ہوتی جو کالجوں کا الحاق کر کے ڈگری سطح پر تعلیم دیتیں۔

میٹرک کے بعد دو سال ایف۔ اے، دو سال بی۔ اے یا بی۔ ایس سی اور پھر دو سال ایم۔ اے یا ایم۔ ایس سی میں صرف ہوتے تھے۔ سارے مضامین انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے ہوتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم طلبا کو خود اپنے خرچ پر حاصل کرنا پڑتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں مزید ترقی کے ساتھ مخلوط تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جو اب تک جاری ہے۔

لڑکیوں کے الگ سکول کالج اور اقامت گاہیں قائم ہو گئیں۔ کامیاب ہونے والے طلبا اور طالبات کو سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں دی جاتیں۔ اس کے علاوہ حکومت برطانیہ نے پیشہ ورانہ ادارے بھی قائم کیے جن میں میڈیکل، قانون، کمرشل و ٹیکنیکل ادارے، زرعی یونیورسٹیاں، انجینئرنگ اور جنگلات سے متعلق ادارے، ویٹرنری کالج، ٹیچرز ٹریننگ کالج، تعلیم بالغاں کے لیے سکول، معذور بچوں کے لیے اور جرائم پیشہ بچوں کے لیے سکول قائم ہوئے۔[۱۱]

مذہبی علوم کے ادارے تقریباً اپنی اہمیت کھو چکے تھے یعنی عملی طور سے عبادت اور تعلیم قطعی طور پر الگ ہو گئے تھے، طلبا کو مذہبی علوم سے قطعی رابطہ یا واسطہ نہ رہا۔ جماعتوں میں طلبا کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی لہٰذا انفرادی توجہ استاد کی طرف سے قطعی نہیں ملتی تھی۔ ایسی صورت میں یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ طالب علم کی ذہنی صلاحیت کیسی ہے یا اس کا رجحان کس مضمون کی طرف زیادہ ہے یا بالکل نہیں ہے۔

جدید طرز تعلیم میں امتحانوں میں کامیابی یا ناکامی کا اندازہ قابلیت سے نہیں لگایا جا سکتا۔

۱۱۔ THE YEAR BOOK OF EDUCATION 1935
P. 106-108

طلبا اور طالبات امتحان پاس کرنے کے لیے بازار سے نوٹس اور نچلے درجے کی چھوٹی کتابیں خرید کر رٹ لیتے ہیں۔ سفارش وغیرہ کا رجحان بھی پایا جاتا ہے اور کئی طریقوں پر عمل ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔

جہاں تک جدید طرز تعلیم (اس کو ہم مغربی طرز تعلیم بھی کہہ سکتے ہیں) کے نظام کا تعلق ہے اس میں پہلے مجموعی طور پر یہ عیوب موجود نہیں تھے۔ یہ خرابیاں رفتہ رفتہ اس طریقۂ تعلیم میں آئی ہیں لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اب ہم اس دور کے طریقۂ تعلیم پر نظر ثانی کر کے اسے اسلامی سانچے میں ڈھالیں۔

چند تجاویز اور مشورے

اپنی گذارشات کے اختتام پر میں نظام تعلیم کے بارے میں چند تجاویز اور مشورے پیش کرنا چاہتا ہوں :-

(۱) اگر حکومت آئندہ کوئی نظام تعلیم رائج کرے تو اس میں تعلیم سے متعلق قرآن و حدیث کے احکام کو پیش نگاہ رکھے۔

(۲) خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور بزرگان سلف سے اس ضمن میں جو کچھ منقول ہے اور انھوں نے جس انداز سے حصول علم پر زور دیا ہے، اس کو مشعل راہ بنایا جائے۔

(۳) نظام تعلیم اور ترتیب نصاب میں نیچے کی سطح سے لے کر اعلیٰ درجوں تک اسلامی اور دینی عنصر کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

(۴) سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، میڈیسن وغیرہ علوم کو خصوصاً مرکز توجہ ٹھہرایا جائے۔

(۵) تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا بالخصوص خیال رکھا جائے اور ان کی انفرادی نگرانی کا اہتمام کیا جائے۔

(۶) ایسی صورت پیدا کی جائے کہ طلبا جو مضامین لیں، ان میں پوری محنت کریں اور ان کے اساتذہ اور نگران اس باب میں ان کی کامل رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

(۷) طلبا میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ آگے چل کر ملک و قوم کے بہترین خادم بن سکیں۔